ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کا انقلابی منہج: چند یادیں چند باتیں

علی محمد رضوی

mudeerislamiinqilab@gmail.com

ملا نہ پھر کہیں لطف کلام تیرے بعد
حدیث شوق رہی ناتمام تیرے بعد

بیاد ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب[1]

ڈاکٹر جاوید انصاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک انسانی وجود میں اصل کشمکش خواہش اور علم کے درمیان ہے۔ جہاں سرمایہ داری خواہشات کی حکمرانی کا نظام ہے، وہاں اسلامی منہج علم کی حکمرانی قائم کرتا ہے۔ تاہم، اس تناظر میں علم اور اطلاع (Information/Data) کے درمیان فرق کرنا لازمی ہے۔

جدید دور میں جسے ہم علم سمجھتے ہیں، وہ دراصل محض اطلاع یا خام ڈیٹا ہے، جو خواہشات کی تکمیل کے لیے ایک آلے (Tool) کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، حقیقی علم وہ نور ہے جو انسان کو کائنات کی حقیقت اور اس کے خالق کے منشا سے آگاہ کرتا ہے۔ سرمایہ داری میں اطلاع خواہش کی خادم ہوتی ہے، جبکہ علم خواہش کا حاکم اور نگران ہوتا ہے۔

علم کا حقیقی مقام محض ذہنی استدلال سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کی بنیاد خشیتِ الٰہی اور تقویٰ پر ہے۔ جیسا کہ قرآن کا فرمان ہے کہ "اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں"۔ پس، تقویٰ کے بغیر علم کا حصول ناممکن ہے کیونکہ جب تک نفس پاک نہ ہو اور دل میں خدا کا خوف نہ ہو، انسان حق اور باطل کے درمیان تمیز نہیں کر سکتا۔

علم انسان کو وہ بصیرت عطا کرتا ہے جس کے ذریعے وہ اپنی خواہشات (نفس) کو پہچانتا اور ان

---

[1] نوٹ: یہ مضمون ڈاکٹر صاحب کے تصورِ انقلاب پر ہماری یادداشتی اور تفکراتی داستان کا پہلا حصہ ہے، انشاء اللہ اگلے حصے میں اس داستان کے باقی اجزاء کو بیان کیا جائے گا۔

کی مخالفت کرتا ہے۔ جہاں خواہش انسان کو آزادی کے فریب میں مبتلا کر کے بندگی سے دور کرتی ہے، وہاں علم اسے خوفِ خدا کے ذریعے حقیقی بندگی کے مقام پر فائز کر دیتا ہے۔

مندرجہ بالا نکات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ اسلامی انقلاب دراصل اطلاع کی بنیاد پر چلنے والی ٹیکنوکریسی کا نام نہیں، بلکہ تقویٰ کی بنیاد پر قائم علمی سیادت کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں انقلابی قیادت کے لیے علمی رسوخ کے ساتھ ساتھ بلند روحانی اور تقویٰ کی سطح شرط قرار دی گئی ہے، کیونکہ تقویٰ ہی وہ چھلنی ہے جو علم کو محض معلومات بننے سے بچاتی ہے۔

اسلام اپنی حقیقت میں علم ہے۔ اس کی پیروی کا اصل تقاضا ہی یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کی حاکمیت کا انکار کرے اور خود کو علم (وحی اور اس سے مستنبط ضوابط) کے تابع کر دے۔

فقہی مذاہب کے مابین کسی خاص مسئلے میں ایک مسلک سے دوسرے مسلک کی طرف انتقال (مثلاً محض آسانی کے لیے کسی دوسرے امام کا قول اختیار کرنا) کو جو ممنوع قرار دیا گیا، اس کی اصل وجہ یہی فکری بنیاد ہے۔ ایک عام آدمی (عامی) کے پاس ایک فقہ کو چھوڑ کر دوسری کو اپنانے کے لیے سوائے اپنی سہولت یا خواہش کے کوئی علمی دلیل نہیں ہوتی۔ اگر اس دروازے کو کھول دیا جائے تو دین علم کی پیروی کے بجائے خواہشات کی تکمیل کا آلہ بن جائے گا، جو سراسر گمراہی کا راستہ ہے۔

خواہش کی پیروی انسان کو منتشر اور ذلیل کر دیتی ہے، جبکہ علم کی پیروی اسے ایک منظم اور ابدی ضابطے کا پابند کر کے ہدایت کی راہ پر گامزن کرتی ہے۔ علم انسان کو وہ استقامت عطاء کرتا ہے کہ وہ اپنے نفس کے تقاضوں کو پہچان کر انہیں رد کر سکے، جبکہ خواہش انسان کو ہر اس جگہ لے جاتی ہے جہاں اسے عارضی لذت یا سہولت نظر آئے۔

یہی وہ نکتہ ہے جہاں سے علماء کی قیادت کا تصور جنم لیتا ہے۔ چونکہ اسلام حاکمیتِ علم کا نام ہے، اس لیے معاشرے اور ریاست کی قیادت کا حقدار وہی گروہ ہے جو علمِ دین میں رسوخ رکھتا ہو

اور جس کا اپنا عمل مخالفتِ نفس اور تقویٰ کی بنیاد پر استوار ہو۔ علماء کی سیادت دراصل علم کی سیادت ہے، جو معاشرے کو خواہشات کے جنگل سے نکال کر بندگیِ رب کی شاہراہ پر چلاتی ہے۔

ہماری اس تشریح سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر انصاری صاحب کے انقلابی منہج میں علماء کا کردار محض مذہبی نہیں بلکہ سیاسی اور اداراتی بھی ہے، کیونکہ وہی اس علم کے محافظ ہیں جو سرمایہ دارانہ خواہش کے سیلاب کے آگے بند باندھ سکتا ہے۔

اسلام اپنی حقیقت میں علم ہے، اور چونکہ علماء اس علمِ نبوی کے وارث ہیں، اس لیے انسانی زندگی کے ہر شعبے میں، خواہ وہ معاشرت ہو، معیشت ہو یا سیاست، وہی ہمارے فطری، شرعی اور روحانی قائد ہیں۔ اس نظام میں قیادت کا معیار تقویٰ، خشیت اور بندگی ہے، جہاں قائد کا منصب فرد کو اس کی نفسانی خواہشات کی غلامی سے نکال کر رضائے الٰہی کے تابع کرنا ہے۔

اس کے برعکس، سرمایہ داری میں قیادت ان لوگوں کے سپرد ہوتی ہے جو خواہشات کی تکمیل، اشتعال اور تسکین کے ماہر ہوتے ہیں۔ یہاں کامیاب قائد وہ ہے جو:

- انسانی جبلتوں کو مشتعل کر کے نئی ضرورتیں پیدا کرے۔
- مارکیٹ اور میڈیا کے ذریعے آرزو کو مادی اشیاء کا اسیر بنا دے۔
- اور پھر ان مادی خواہشات کی تسکین کے نت نئے ذرائع فراہم کر کے منافع سمیٹے۔

پس، سرمایہ دارانہ قیادت دراصل اتباعِ شہوات کی ایک منظم شکل ہے جہاں ماہرینِ معیشت اور اربابِ بست و کشاد کا اصل فن ہی یہ ہے کہ وہ انسان کو اس کے نفس کا بندہ بنائے رکھیں۔

جبکہ اسلامی منہج میں علماء کی قیادت کا مقصد اتباعِ علم ہے جو انسان کو خواہش کے جنگل سے نکال کر ہدایت کے نور اور ابدی نجات (نجاتِ اخروی) کی طرف لے جاتی ہے۔ ایک طرف وارثینِ انبیاء کی علمی و روحانی قیادت ہے اور دوسری طرف تاجرانِ ہوس کی مادی سیادت۔ یہ تقابل دراصل دو متصادم تہذیبوں کے جوہر کو بے نقاب کرتا ہے۔

یہ نکتہ ڈاکٹر انصاری صاحب کے اس موقف کو مزید تقویت دیتا ہے کہ جب تک قیادت

خواہش کے ماہرین (Technocrats/Capitalists) کے ہاتھوں میں رہے گی، معاشرہ کبھی بھی بندگیِ رب کے سانچے میں نہیں ڈھل سکے گا۔ حقیقی تبدیلی تب ہی آئے گی جب زندگی کے ہر شعبے کا رخ علمِ وحی اور اس کے حاملین (علماء) کی طرف مڑ جائے گا۔

سرمایہ دارانہ نظام کا مقصد فلاح (Well-being) ہے، جس کا پیمانہ مادی ترقی اور خواہشات کی تسکین ہے۔ اس کے برعکس اسلامی انقلاب کا مقصد نجات (Salvation) ہے، جس کا تعلق اخروی کامیابی اور بندگیِ الٰہی سے ہے۔ جب مقصد بدل جاتا ہے، تو انقلاب کی پوری سمت بدل جاتی ہے۔

یہ انقلاب اس لیے روحانی ہے کیونکہ اس کا پہلا معرکہ انسان کے اندر (نفس کے خلاف) لڑا جاتا ہے۔ یہ حاکمیتِ نفس کو ختم کرکے حاکمیتِ الٰہی کو دل کے تخت پر بٹھانے کا نام ہے۔ اگر روح بندگی کے لیے تیار نہ ہو، تو بیرونی سیاسی تبدیلی محض ایک ڈھانچہ ہوگی جس میں روحِ اسلام مفقود ہوگی۔

یہ علمی انقلاب اس لیے ہے کیونکہ یہ کائنات، انسان اور زندگی کے بارے میں مروجہ مادی تصورات (Modernity/Capitalism) کو رد کرکے علمِ وحی کی بنیاد پر ایک نیا علمیاتی فریم ورک (Epistemology) پیش کرتا ہے۔ یہاں علم کا کام خواہشات کی بندگی کے لیے اطلاعات فراہم کرنا نہیں، بلکہ حق کی پہچان کروا کر نفس کو لگام ڈالنا ہے۔

چونکہ فرد کی نجات اس معاشرتی اور ریاستی جبر کے ماحول میں ناممکن ہے جو اسے مسلسل عبدِ درہم و دینار (سرمایے کا بندہ) بنانے پر تلا ہوا ہے، اس لیے یہ روحانی اور علمی انقلاب ناگزیر طور پر ایک سیاسی اور اداراتی انقلاب کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ فرد کی نجات کے لیے اس نظام کا ٹوٹنا ضروری ہے جو نجات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یوں یہ محض ایک اخلاقی بیان نہیں، بلکہ ایک تبدیلیِ نظام (Systemic Change) کا پیش لفظ ہے۔

انسانی وجود میں خواہشات اور ان کی مطلق العنان حکمرانی جس راستے سے داخل ہوتی ہے، اس کا نام آزادی ہے۔ جدید تناظر میں آزادی محض ایک سیاسی اصطلاح نہیں، بلکہ ایک باطل

معبود ہے جس کی پرستش انسان کو ناگزیر طور پر خواہشات کی پرستش (اتباعِ شہوات) کی طرف لے جاتی ہے۔ جب انسان خود کو وحی اور خدائی ضابطوں سے آزاد تصور کر لیتا ہے، تو اس کا نفس ہی اس کا حاکم بن جاتا ہے۔

خواہشات کی یہ پرستش اپنی منطقی انتہا پر سرمایہ داری کو جنم دیتی ہے۔ سرمایہ داری محض ایک معاشی نظام نہیں، بلکہ خواہشات کی لامحدود تسکین کا ادارتی ڈھانچہ ہے۔ اس پورے عمل میں سرمایہ دراصل انسانی خواہشات کی ایک محسوس اور مجسم (Concrete) شکل ہے۔

سرمایہ وہ قوت ہے جو تخیلاتی خواہش کو مادی حقیقت میں بدلنے کی طاقت رکھتی ہے۔ پس، جس معاشرے کا قبلہ آزادی ہو گا، وہاں ہر فرد اپنی خواہش کا بندہ ہو گا، اور ان بے شمار خواہشات کی تسکین کے لیے سرمایہ ہی وہ واحد اور حتمی پیمانہ قرار پائے گا جس کے گرد پوری زندگی گردش کرے گی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آزادی کا سفر سرمایے کی بندگی پر ختم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر انصاری صاحب کے فکر کے مطابق، اسی لیے جب تک آزادی کے اس بت کو نہیں توڑا جائے گا، سرمایہ داری کے عالمی جبر سے نجات ممکن نہیں۔ اسلامی انقلاب اس آزادی کے مقابلے میں بندگی کا تصور پیش کرتا ہے، جو دراصل نفس کی غلامی سے نجات اور صرف حق کے سامنے بدن و روح کے تسلیم کلی کا نام ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے انقلابی منہج پر سوچتے ہوئے یہ شعر یاد آیا جو ڈاکٹر صاحب نے اسی سیاق میں کئی بار سنایا اور لکھا:

تیری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
میری دعا ہے تری آرزو بدل جائے!

ڈاکٹر صاحب کے یہاں علامہ اقبال کی شاعری کا استعمال اور اس کی گہرائیاں خود اپنے آپ میں ایک موضوع ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے تحریری اور تقریری سیاق میں اس شعر کا بار بار آنا اس بات کی علامت ہے

کہ وہ اصلاح (Reform) کے بجائے یکسر تبدیلی (Transformation) کے قائل ہیں۔

تیری دعا یعنی وہ روایتی مذہبی یا سیاسی خواہش جو موجودہ فریم ورک کے اندر ہی رہ کر کچھ سہولتیں مانگتی ہے۔

میری دعا یعنی وہ انقلابی تمنا جو پورے فریم ورک اور انسانی ترجیحات کو ہی بدل ڈالنے کی خواہاں ہے۔

اسی سیاق میں ایران پر اپنے آخری مضمون میں لکھا:

"اشتراکی اور اسلامی انقلاب میں یہی بنیادی فرق ہے۔ اشتراکی انقلاب عوام کی خواہشات کو بڑھاتا ہے، جبکہ اسلامی انقلاب عوام کو قربانی دینے پر آمادہ کرتا ہے۔"

یہ اقتباس اس فرق کو واضح کرتا ہے جسے سیاسی اصطلاح میں مطالبات کی سیاست اور فرائض کی سیاست کے درمیان خلیج کہا جاسکتا ہے۔

اس جملے کی فکری گہرائی کو اگر ہم پچھلے نکات (آزادی بمقابلہ عبادت) سے جوڑ کر دیکھیں تو چند اہم پہلو نمایاں ہوتے ہیں:

۱۔ اشتراکیت: خواہشات کی مادی توسیع

اشتراکی انقلاب (Socialist Revolution) اگرچہ سرمایہ داری کی مخالفت کرتا ہے، لیکن وہ انسانی خواہشات کی مرکزیت کے معاملے میں سرمایہ داری ہی کا ایک تسلسل ثابت ہوتا ہے۔ اشتراکیت عوام سے یہ وعدہ کرتی ہے کہ ان کی مادی محرومیوں کو ختم کرکے ان کی تمام خواہشات اور ضروریات کو پورا کیا جائے گا۔ اس کا پورا زور تقسیمِ دولت اور حقوق کی فراہمی پر ہوتا ہے جس کا منطقی نتیجہ عوام میں مادی خواہشات کے مزید پھیلنے کی صورت میں نکلتا ہے۔

۲۔ اسلامی انقلاب: قربانی اور تزکیہ

اس کے برعکس، اسلامی انقلاب (جیسا کہ ایران کے تناظر میں ڈاکٹر صاحب نے مشاہدہ کیا)

مادی مفادات کے گرد نہیں گھومتا۔ یہ انقلاب عوام کو یہ نہیں کہتا کہ "تمھیں کیا ملے گا"، بلکہ یہ سوال اٹھاتا ہے کہ "تم اللہ کے لیے کیا دے سکتے ہو"۔ قربانی (Sacrifice) یہاں محض ایک جذباتی اصطلاح نہیں، بلکہ ایک شعوری انتخاب ہے جس میں انسان اپنی خواہش (جسے ہم نے آزادی اور نفس سے تعبیر کیا تھا) کو اللہ کے حکم پر نثار کر دیتا ہے۔

۳۔ خواہشات کا بڑھنا بمقابلہ آرزو کا بدلنا

اشتراکیت عوام کی موجودہ آرزوؤں کی تکمیل کا راستہ دکھا کر انہیں متحرک کرتی ہے۔ اسلامی انقلاب عوام کی آرزو کو ہی بدل دینے کا تقاضا کرتا ہے۔

جب عوام اس بات پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ ان کا اصل کمال لینے میں نہیں بلکہ دینے میں ہے، تو وہ سرمایہ دارانہ اور مادی بیڑیوں سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں عبادت اپنی اصل شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ یعنی بندہ اپنے آپ کو مٹانے اور قربان کرنے میں لذت محسوس کرنے لگتا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلامی انقلاب کوئی معاشی پروگرام نہیں ہے، بلکہ ایک اخلاقی، روحانی اور مابعد الطبیعیاتی تبدیلی ہے جو انسان کو حقوق کے مطالبے سے نکال کر فرائض کی ادائیگی اور قربانی کے جذبے تک لے آتی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام دراصل خواہشات کی حکمرانی کا دوسرا نام ہے جہاں انسانی زندگی کا کل مقصد ہی خواہشوں کی غلامی اور ان کی بلا روک ٹوک تکمیل قرار پاتا ہے۔ یہاں لفظ خواہش ایک دوہرے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے: ایک طرف یہ مادی لذتوں کے حصول کا نام ہے، اور دوسری طرف یہ اس خود مختار انسانی ارادے کی علامت ہے جو کسی خدائی ضابطے کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

اس کے برعکس، اسلامی انقلاب کا اصل ہدف محض سیاسی یا معاشی تبدیلی نہیں، بلکہ انسانی آرزو کے قبلے کی تبدیلی ہے۔ یہ انقلاب انسان کو خواہش کی حکمرانی کے سحر سے نکال کر اسے اس بلند تر مقام پر لاتا ہے جہاں وہ محض خواہشات کی تکمیل کے پیچھے بھاگنا ترک کر دیتا ہے۔

یہ ایک بنیادی فکری ہجرت ہے: یعنی اپنی مرضی کو پورا کرنے کی تڑپ سے دستبردار ہو کر رضائے الٰہی کی طلب کو اپنا لینا جو سراسر مخالفتِ نفس میں پوشیدہ ہے۔ پس اسلامی انقلاب کا جوہر یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کے بجائے ان کی مخالفت کرے، تا کہ اس کی بندگی کامل ہو سکے اور وہ کائنات کے اصل حاکم کے احکامات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔

روایتی تحریکوں کے برعکس، جہاں تبدیلی کو ایک خطی (Linear) عمل سمجھا جاتا ہے، ڈاکٹر صاحب کا تصورِ انقلاب ہمہ جہت (Simultaneous) ہے۔

اسلامی انقلاب: انفرادی نجات اور ہمہ جہت سماجی تغیر

اسلامی انقلاب کا جوہر دراصل فرد کی نجات ہے، اور اس اخروی و دنیوی مقصد کی بدولت یہ بنیادی طور پر ایک روحانی اور علمی انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم، چونکہ فرد کی انفرادیت خلا میں پرورش نہیں پاتی بلکہ معاشرے کے بطون میں متشکل ہوتی ہے، اس لیے فرد کی حقیقی نجات ریاست اور سماج کی کلی تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اسی تناظر میں ڈاکٹر صاحب انقلاب کی اس روایتی سٹیج تھیوری (Stage Theory) کو مسترد کرتے ہیں جس کے مطابق پہلے محض فرد کی اصلاح ہو گی، پھر معاشرہ بدلے گا اور آخر میں ریاست کی باری آئے گی۔ اس کے برعکس، ڈاکٹر صاحب کا استدلال یہ ہے کہ انقلابی جدوجہد ان تینوں سطحوں، یعنی فرد، معاشرہ اور ریاست، پر بیک وقت وقوع پذیر ہوتی ہے۔

یہ ایک ایسا مربوط عمل ہے جہاں ایک سطح پر آنے والی تبدیلی دوسری سطح کے تغیر کے لیے محرک بنتی ہے۔ فرد کا تزکیہ سماجی ڈھانچے پر اثر انداز ہوتا ہے اور ریاستی و سماجی تبدیلی فرد کے لیے بندگیِ الٰہی کی راہ ہموار کرتی ہے۔ پس ڈاکٹر صاحب کے نزدیک انقلاب کوئی تدریجی مرحلہ وار سفر نہیں، بلکہ ایک ہمہ گیر کشمکش ہے جو انسانی زندگی کے تمام ابعاد کو ایک ساتھ اپنی لپیٹ میں لیتی ہے۔

اس نکتے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں عبادت اور قربانی کا تصور صرف

انفرادی سطح تک محدود نہیں، بلکہ وہ انفرادی تقویٰ کو ایک ایسی اجتماعی قوت میں بدلنا چاہتے ہیں جو سرمایہ دارانہ ریاست کے جبر کو توڑ کر رضائے الٰہی کے قیام کا راستہ صاف کر سکے۔

جدید ریاست کا جبر اور انقلابی تکون: فرد، معاشرہ اور بندگی

موجودہ عہد میں ریاست کا کردار اس قدر کلیدی ہو چکا ہے اور اس کی گرفت انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر اتنی مضبوط ہے کہ ریاست کے ڈھانچے میں انقلابی تبدیلی کے بغیر معاشرے اور فرد میں کسی حقیقی تغیر کا تصور محال نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید انقلابی جدوجہد میں ریاست ایک ناگزیر ہدف بن کر ابھرتی ہے۔

تاہم، اس حقیقت کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی یکساں اہمیت کا حامل ہے کہ ریاست کی تبدیلی بذاتِ خود ایک قائم بالذات معاشرتی حقیقت (Socio-cultural Reality) کے بغیر ناممکن ہے۔ معاشرہ محض افراد کا مجموعہ یا ریاست کا تابع دار ادارہ نہیں، بلکہ اپنی جگہ ایک مستقل وجود رکھتا ہے جس کی اپنی اقدار اور روایات ہوتی ہیں۔ لہٰذا، ریاست پر توجہ مرکوز کرنے کے نتیجے میں فرد کی نجات کا وہ بنیادی ہدف کبھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے جو کہ اصل مقصودِ بالذات ہے۔

اسی نازک توازن کو برقرار رکھنے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ اس انقلابی عمل کی قیادت ایسے علماء کے ہاتھوں میں ہو جو بلند ترین روحانی مقامات پر فائز ہوں۔ اگر قیادت محض سیاسی یا انتظامی نوعیت کی ہوگی، تو ریاست کی تبدیلی کے عمل میں فرد کی روحانی نجات اور بندگی کا جوہر مفقود ہو جائے گا۔ پس، ایک سچا اسلامی انقلاب وہی ہے جہاں ریاست کی قوت، معاشرے کی حرکیات اور فرد کا تزکیہ، ایک ایسی روحانی قیادت کے زیرِ اثر ہوں جو نظام کی تبدیلی کو رضائے الٰہی اور فرد کی نجات کے تابع رکھ سکے۔

جدید سرمایہ دارانہ ریاست کے ہمہ گیر غلبے کو توڑنے کے لیے محض سیاسی نعرہ بازی کافی نہیں، بلکہ معاشرتی سطح پر ایک ایسی ادارتی صف بندی (Institutional Alignment) ضروری ہے جو اپنی بقا کے لیے موجودہ نظام کی محتاج نہ ہو۔

معاشرتی ادارتی صف بندی اور ریاست درونِ ریاست کا قیام

جدید دور میں ریاست محض ایک انتظامی ادارہ نہیں بلکہ ایک ایسا جبر ہے جو تعلیم، معیشت اور قانون کے ذریعے فرد کی آرزو کو سرمایہ دارانہ سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ اس جبر کا مقابلہ کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ معاشرے کی سطح پر ایک ایسی متوازی ادارتی صف بندی کی جائے جو اپنی ہئیت میں انقلابی اور اپنی روح میں اسلامی ہو۔

ا۔ ریاست درونِ ریاست کا تصور

یہ محض ایک سیاسی اصطلاح نہیں، بلکہ ایک ایسی سماجی حقیقت کا قیام ہے جہاں مسلمان اپنی معیشت، تعلیم، تنازعات کے حل اور سماجی بہبود کے لیے موجودہ طاغوتی ریاست کے بجائے اپنے خود مختار اداروں پر انحصار کریں۔ جب معاشرہ اپنی ضرورتوں کے لیے نظام کا محتاج نہیں رہتا، تو ریاست کی گرفت کمزور پڑنے لگتی ہے۔

۲۔ ادارتی صف بندی کی ضرورت

انقلاب محض افراد کے ہجوم سے نہیں، بلکہ مستحکم اداروں سے آتا ہے۔ تعلیم سے لے کر معیشت تک، ہر شعبے میں ایسی صف بندی ضروری ہے جو تکمیلِ خواہش کے بجائے رضائے الٰہی اور مخالفتِ نفس کے اصولوں پر استوار ہو۔ یہ ادارے فرد کو وہ فکری اور مادی تحفظ فراہم کرتے ہیں جو اسے ریاست کے جبر کے سامنے ڈٹ جانے کے قابل بناتا ہے۔

۳۔ معاشرہ بطور قائم بالذات حقیقت

اگر معاشرہ اپنی سطح پر منظم ہو کر ایک ریاست درونِ ریاست کی شکل اختیار کر لے، تو سیاسی انقلاب محض ایک حتمی نتیجے کے طور پر برپا ہوتا ہے۔ اس عمل میں معاشرہ اپنی انفرادیت کو ریاست کے غلبے سے آزاد کراتا ہے اور ایک ایسا متبادل ڈھانچہ کھڑا کرتا ہے جو مستقبل کی اسلامی ریاست کی بنیاد بنتا ہے۔

مندرجہ بالا نکات اس سچائی کو واضح کرتے ہیں کہ جب تک ہم معاشرتی سطح پر اپنے متبادل ادارے (تعلیمی، معاشی اور عدالتی) قائم نہیں کرتے، تب تک فرد کی نجات اور ریاست کی

تبدیلی محض ایک خواب رہے گی۔ یہ ادارتی صف بندی ہی دراصل وہ عملی ڈھال ہے جو انقلابی تحریک کو نظام کے اثرات سے محفوظ رکھتی ہے۔

متبادل معاشرتی نظم: نئی ریاست اور کلی انقلاب کا پیش خیمہ

معاشرتی سطح پر ادارتی صف بندی اور ریاست درونِ ریاست کا قیام محض ایک دفاعی حکمتِ عملی نہیں، بلکہ یہ عمل دراصل نئی ریاست کے قیام اور کلی انقلاب کا ناگزیر پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔

۱۔ نظام کا متبادل ڈھانچہ

جب معاشرہ تعلیم، معیشت اور انصاف کے لیے موجودہ طاغوتی ریاست کے بجائے اپنے انقلابی اداروں پر انحصار کرنے لگتا ہے، تو پرانے نظام کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔ یہ متبادل ڈھانچہ ہی وہ سیاسی اور سماجی طاقت فراہم کرتا ہے جو پرانی ریاست کے جبر کو چیلنج کرنے کے قابل ہوتی ہے۔

۲۔ کلی انقلاب کی بنیاد

کلی انقلاب محض اقتدار کی تبدیلی کا نام نہیں، بلکہ یہ زندگی کے تمام شعبوں میں ایک نئے قبلے کے تعین کا نام ہے۔ جب معاشرہ اپنی سطح پر مخالفتِ نفس اور بندگیِ الٰہی کے اصولوں کو ادارتی شکل دے چکا ہوتا ہے، تو نئی ریاست کا قیام ایک منطقی نتیجہ (Logical Conclusion) بن جاتا ہے۔

۳۔ پیش خیمہ اور تسلسل

یہ متوازی نظام ہی نئی ریاست کے لیے وہ تربیت یافتہ افرادی قوت اور فکری فریم ورک فراہم کرتا ہے جو انقلاب کے بعد نظام کو چلانے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح، انقلاب ایک اچانک حادثہ نہیں رہتا، بلکہ ایک ایسے طویل اور منظم عمل کا ثمر بن جاتا ہے جس کی جڑیں معاشرے کے بطون میں گہری ہو چکی ہوتی ہیں۔

اس فکر کے مطابق، اسلامی انقلاب کا راستہ اوپر سے نیچے (Top-down) کے بجائے ایک

ایسے مربوط عمل سے گزرتا ہے جہاں معاشرے کی ادارتی تطہیر نئی ریاست کے ظہور کی راہ ہموار کرتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں فرد کی نجات، معاشرے کی ترتیبِ نو اور ریاست کا قیام ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہو کر کلی انقلاب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔